66

آداب ملاقات اور سفر یورپ کی اصل غرض

(فرمودہ ۲۳ مئی ۱۹۲۴ء)

تشہد و تعوذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور انور نے فرمایا:

میں نے پچھلے دنوں ایک امر کے متعلق مشورہ لیا تھا۔ اور اب بھی اسی امر کے متعلق ایک الگ مشورہ لیا ہے۔ ان مشوروں کے لینے کی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ وہ امر ایسے طور پر مشہور ہو چکا ہے کہ اس کا اب مخفی رکھنا ٹھیک نہیں۔ اس لئے میں اس میں حرج نہیں سمجھتا کہ خطبہ میں اس کا اظہار کر دوں۔ وہ امر میرے ولایت جانے کے متعلق ہے۔ اس کی نسبت میں نے جماعت سے مشورہ لیا ہے کہ یہ وقت میرے ولایت جانے کے لئے بہتر ہے یا نہیں اور جماعت کے لوگوں سے آراء طلب کی گئی ہیں۔ تاکہ جانے کے متعلق فیصلہ ہو۔ چنانچہ رائیں اور مشورے باہر کی جماعتوں کے آ رہے ہیں۔

اور انہی مشوروں کی ضمن میں اور اسی تحریک کی اثناء میں ایک دوست نے خط لکھا ہے۔ جس میں وہ لکھتے ہیں گو میں غیر مبائع ہوں۔ لیکن مجھے آپ سے بعض مبایعین سے بھی زیادہ محبت ہے۔ اس لئے اس تحریک کے موقعہ پر میں بھی مشورہ دیتا ہوں اور اپنی رائے کا اظہار کرتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے خط میں میرے جانے کے متعلق مشورہ دیا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ میں ان کے مشورہ کو بیان کروں ان کے اس فقرہ کے متعلق جو انہوں نے لکھا ہے۔ کہ مجھے آپ کے ساتھ بعض مبایعین کی نسبت زیادہ محبت ہے۔ کچھ بیان کرنا چاہتا ہوں۔

وہ یہ کہ اس قول کو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کیونکہ اگر کوئی شخص کسی امر کا دعویٰ کرے اور اس کے دعویٰ کی کوئی مخالفت نہ کرے اور نہ ہی اس کے دعویٰ کے برخلاف ہمارے پاس ایسے دلائل موجود ہوں جن سے اس کے دعویٰ کی تردید ہو سکے تو ہم اس صورت میں اس کے دعویٰ کو تسلیم کر

لیں گے۔ بہ نسبت اس شخص کے دعویٰ کے کہ اس کے دعویٰ کے برخلاف کوئی کھڑا ہو اور وہ اس کے دعوے کو توڑ دے۔۔ یا ہمیں اس کے دعوے کو بطلان کے متعلق کافی دلائل مل گے ہوں یا دلائل تو نہ ملے ہوں لیکن خود ہی اس نے اپنے دعویٰ کو چھوڑ دیا ہو اس صورت میں ہم اس شخص کے دعویٰ کو قبول نہیں کریں گے چونکہ یہ صاحب لکھتے ہیں کہ مجھے آپ کے ساتھ بعض مبایعین کی نسبت زیادہ محبت ہے۔ جب تک ان کے اس دعویٰ کے برخلاف ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل نہ ہو۔ جو اس دعویٰ کو توڑ دے یا اس دعوے کی تردید کردے۔ تب تک ہم اس دعوے کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور ان کے مشورے دینے کو ایک مخلصانہ فعل قرار دیتے ہیں۔ گو وہ سلوک جو غیر مبایعین نے ہمارے ساتھ کیا ہے۔ وہ ایسا برا سلوک ہے کہ ایسا ہم سے ہندوؤں نے سکھوں اور عیسائیوں نے اور دیگر مذاہب والوں نے بھی نہیں کیا۔ اور وہ فحش کلامی اور وہ ایذا رسانی جو ان لوگوں کی طرف سے ہمارے متعلق برتی گئی ہے۔ اس کی مثال دوسری قوموں میں نہیں ملتی۔ ان کی اس ایذا رسانی کے ہوتے ہوئے ان کے متعلق یہ خیال کرلینا کہ کوئی شخص ان میں ایسا بھی ہے۔ عجیب بات ہے۔ لیکن چونکہ خط لکھنے والے صاحب اس بات کے مقر ہیں کہ ان کا تعلق ہمارے ساتھ بعض مبایع کی نسبت بھی زیادہ ہے اور پھر ان کے اس کہنے کے برخلاف ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل بھی نہیں۔ جو اس دعویٰ کو توڑ دے۔ اس لئے میں ان کے اخلاص کو تسلیم کرتا ہوں۔ اور سمجھتا ہوں کہ ان کا مشورہ ایک مخلصانہ مشورہ ہے۔ لیکن چونکہ میں نے ولایت جانے کے متعلق ابھی تک رائے قائم نہیں کی۔ اور چالیس آدمیوں کو استخارہ کے لئے کہا ہے کہ وہ استخارہ کرکے بتائیں کہ یہ وقت ولایت جانے کے لئے مناسب ہے یا نہیں اور خود بھی استخارہ کر رہا ہوں۔ اور خیال ہے کہ جب تمام جماعت کی رائیں آجائیں۔ اور استخارے بھی ہو جائیں تب ولایت جانے کے متعلق فیصلہ ہو۔

اس لئے ولایت جانے کے امر کو چھوڑ کر میں فی الحال خط کی ایک اور بات کی نسبت جو انہوں نے لکھی ہے۔ کچھ کہتا ہوں گو میں اس بات کی نسبت ایسا نہیں سمجھتا کہ ہماری جماعت میں اس حد تک پائی جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی اس کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اسی بات کی نسبت جو انہوں نے اپنے خط میں لکھی ہے مجھے باہر سے اور کئی لوگوں کی شکایت بھی آئی ہے۔

وہ اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ قادیان میں عموماً" عام لوگ آپس میں السلام علیکم نہیں کہتے۔ لیکن خصوصیت سے وہ لوگ جو کہ بڑے عہدوں پر متمکن ہیں۔ میرے خیال میں یہ ان کا خیال صحیح نہیں موجودہ زمانہ میں سلام کا مسئلہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہو گیا ہے جس کی کئی وجوہات ہیں۔ مثلاً بعض طبائع

میں حجاب ہوتا ہے۔ جس سے وہ آپس میں بلند آواز سے سلام نہیں کرسکتے اور جب کسی سے ملتے ہیں۔ تو آہستہ سے سلام کہہ دیتے ہیں یا آہستہ سے جواب دے دیتے ہیں۔ اس پر سلام کرنے والا سمجھتا ہے کہ میں نے سلام کیا ہے۔ یا جواب دینے والا خیال کرتا ہے۔ کہ میں نے جواب دے دیا ہے۔ لیکن دوسرا اس کے جواب کو بوجہ آہستہ ہونے کے نہیں سن سکتا۔ اور خیال کرتا ہے کہ یہ متکبر ہے۔ اس نے میرے سلام کا جواب تک نہیں دیا۔ اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ جواب دینے والا ایسا آہستہ جواب دیتا ہے۔ کہ سلام کرنے والا اس کے جواب کو نہیں سنتا۔ کیونکہ اس کے کان اونچی آواز سننے کے منتظر ہوتے ہیں۔ جب آہستہ جواب ملتا ہے۔ تو وہ سن نہیں سکتے۔ اس پر وہ شخص خیال کرلیتا ہے کہ اس نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا۔ حالانکہ اس نے جواب دیا ہوتا ہے مگراس نے سنا نہیں ہوتا تو یہ ایک قسم کا حجاب ہوتا ہے۔

یہی حجاب میرے اندر شروع میں تھا لوگ مجھ کو سلام کرتے تھے۔ اور میں ان کے سلام کا جواب دیتا تھا۔ لیکن چونکہ میں اپنی عادت کے مطابق آہستہ جواب دیتا تھا۔ اس لئے وہ سن نہ سکتے تھے۔ اور خیال کرتے تھے کہ میں نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ حالانکہ میں ان کے سلام کا جواب دیتا تھا۔ جواب نہ سننے کی وجہ سے بعض مجھے متکبر کہتے تھے۔ چنانچہ وہ لوگ جو غیر مبائع ہو گئے۔ انہوں نے اسی وجہ سے میری نسبت کہا کہ وہ متکبر ہیں۔ سلام کا جواب تک نہیں دیتے اور وہ یہ کہنے میں معذور تھے کیونکہ یہ میری عادت تھی کہ میں سلام کا اونچا جواب نہیں دے سکتا تھا چونکہ لوگ مجھے سلام کہہ کر اونچا جواب سننے کے منتظر ہوتے تھے۔ اور ان کے کان اونچا جواب سننے کے لئے تیار ہوتے تھے۔ اور میں ان کی امیدوں کے برخلاف آہستہ جواب دیتا تھا۔ اس لئے وہ سن نہ سکتے تھے۔ اور خیال کرتے تھے کہ ان کے سلام کا جواب نہیں دیا گیا۔

شاید کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئے کہ اونچی آواز سننے کے منتظر ہونے کی وجہ سے کیونکر نیچی آواز نہیں سنائی دے سکتی۔ مگر یہ بالکل آسان ہے۔ اس کی مثال بعینہٖ یہ ہے کہ اگر ایک پنسل ایک میز پر پڑی ہو اور ایک آدمی اس کو اٹھانا چاہے۔ تو اسے اٹھانے کے لئے اس کے ہاتھ کے اندر اتنی ہی طاقت پیدا ہوگی جس کے ذریعہ وہ پنسل کو اٹھالے گا۔ اور اٹھانے میں اس کو اپنے ہاتھ کی تھوڑی سی طاقت خرچ کرنی پڑے گی۔ لیکن اگر وہی پنسل لیوی کے ذریعے میز سے چپکائی ہوئی ہو جس کا اسے علم نہ ہو۔ تو وہ اتنی طاقت سے جو اس نے پہلے پنسل کے اٹھانے میں خرچ کی تھی۔ پنسل کو میز سے نہ اٹھائے گا پھر اور طاقت ہاتھ کے اندر پیدا کرکے پنسل کو میز سے اٹھائے گا۔ دوسری دفعہ وہ

پنسل کے اٹھانے میں کیوں ناکام رہا۔ اس لئے کہ اس نے اتنی طاقت پنسل کے اٹھانے میں خرچ کی تھی۔ جتنی کہ اس نے پہلی دفعہ جبکہ پنسل لیوی سے چپکی ہوئی نہ تھی۔ خرچ کی تھی۔ اور چونکہ اس کا ہاتھ اس قدر طاقت خرچ کرنے کے لئے تیار ہو کر نہ آیا تھا۔ جس قدر چاہیئے تھی۔ اس لئے پنسل اٹھائی نہ جا سکی۔ لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ پنسل چپکی ہوئی ہے۔ تو اور طاقت اس نے صرف کر کے پنسل کو اٹھایا۔ یہی حال انسان کے اعضاء کا ہے۔ کہ وہ کسی کام کے کرنے کے وقت اندازہ لگا لیتے ہیں کہ اس کام کے کرنے میں کتنی طاقت صرف ہو گی۔ اور پھر وہ اتنی ہی طاقت اپنے اندر مہیا کر کے اس کام کو کر لیتے ہیں۔ بعینہٖ یہی حالت کانوں کی ہے۔ وہ چونکہ اونچی آواز سننے کے عادی ہوتے ہیں اس لئے اونچی آواز سننے کے منتظر رہتے ہیں۔ اور اتنی ہی طاقت اپنے اندر مہیا رکھتے ہیں کہ اونچی آواز سن سکیں۔ لیکن جب وہ اپنی توقع کے خلاف آہستہ آواز سنتے ہیں۔ تو اسے نہیں سن سکتے اور سننے والے کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کچھ سنا ہی نہیں اور نہ سننے کی وجہ سے سلام کرنے والا خیال کرتا ہے کہ اس کے سلام کا جواب نہیں دیا گیا۔ اور اس کے سلام کی پرواہ نہیں کی گئی۔ مگر دونوں اصل میں معذور ہوتے ہیں۔ کیونکہ اصل وجہ وہی ہے۔ جو میں پہلے بتلا آیا ہوں۔

ایک ہمارا ہم جماعت بہرہ تھا اور دوسرے بہروں کے برخلاف بہت آہستہ بولتا تھا۔ اس سے بات چیت تو بلند آواز سے کی جاتی تھی۔ لیکن بہرہ ہونے کی وجہ سے وہ چونکہ بہت آہستہ سنتا تھا۔ اس لئے بولتا بھی آہستہ تھا۔ اور بعض اوقات کلام کرتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ منہ میں بُڑبڑا رہا ہے ایسے شخص سے اگر کوئی بلند آواز میں سلام کے جواب کی توقع رکھے۔ اور پھر نہ سنے۔ تو دونوں اپنی اپنی جگہ معذور ہوں گے۔ پس بعض لوگ سلام کا جواب اپنی عادت کے موافق آہستہ دیتے ہیں۔ اور سلام کرنے والا ان کے جواب کو اچھی طرح سن نہیں سکتا۔ اس لئے وہ خیال کرتا ہے کہ میرے سلام کا جواب نہیں دیا گیا۔ اور بد ظن ہو کر شکایت کرتا ہے۔

تو جیسا کہ مجھے آہستہ جواب دینے کی عادت تھی۔ ایسا ہی ہماری جماعت کے بعض لوگوں میں ہے اور ان کے لئے میری مثال عذر ہے۔ لیکن پھر بھی میں کہتا ہوں کیا شریعت کے مقررہ سلام سے یہی منشاء ہے کہ انسان صرف سلام کے لفظ کو منہ سے ادا کر دے۔ خواہ اس کو دوسرا سنے یا نہ سنے۔ اگر صرف کہہ دینا ہی کافی ہوتا۔ اور دوسرے کو سنانا اور اس کا جواب لینا ضروری نہ ہوتا تو شریعت میں سلام کو آہستہ کہنے کا ہی حکم ہوتا اور جس طرح ہم آہستہ نماز میں تسبیح اور تحمید پڑھتے ہیں اسی طرح ہم آہستہ سلام بھی کہہ دیتے اور شریعت میں یہ نہ قرار دیا جاتا کہ سلام سن کر اس کا جواب

وعلیکم السلام دیا جائے۔ شریعت نے جب السلام علیکم کے جواب میں و علیکم السلام رکھا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ السلام علیکم بلند آواز سے کہنا چاہیئے تاکہ دوسرا سنے اور سلام کا جواب دے پس چونکہ آہستہ سلام کہنے سے وہ غرض جس کے لئے شریعت نے سلام کو جاری کیا ہے۔ مفقود ہوتی ہے۔ اور آہستہ سلام کرنا نہ صرف شریعت کی غرض کو ہی پورا نہیں کرتا۔ بلکہ سلام نہ کہنے کے برابر ہے اس لئے تمہیں چاہیئے کہ تم اونچا سلام کہو تاکہ شریعت کی غرض پوری ہو اور اس شکایت کو دور کرو جو آسانی سے دور کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ جس طرح تمہارے متعلق شکایت کی جاتی ہے۔ اسی طرح جب میرے متعلق متواتر مجھ کو شکایت پہنچی کہ میں لوگوں کے سلام کا جواب نہیں دیتا۔ تو میں نے کوشش شروع کی کہ میں سلام کا جواب اتنی اونچی آواز سے دوں کہ سلام کرنے والا وعلیکم السلام سن لے اور سلام کا جواب نہ دینے کی شکایت نہ کرے میں نے آواز کو اونچا کیا اور اب اونچی آواز سے جواب دیتا ہوں۔ میں نے چونکہ یہ تبدیلی جلدی کر لی اور آہستہ جواب دینے کی عادت کو چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے میں اس تجربہ کی بناء پر کہتا ہوں کہ وہ لوگ جن کو آہستہ سلام کا جواب دینے کی عادت ہو۔ جلدی اس عادت کو چھوڑ سکتے ہیں۔ اور وہ جلدی عادی ہو سکتے ہیں کہ سلام کا جواب اونچی آواز سے دیں پس تم اونچی آواز سے سلام کا جواب دو اور اس آہستہ جواب دینے کی عادت کو چھوڑ دو۔

کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن کی علامتوں میں سے ایک سلام کے کہنے کو بھی قرار دیا ہے۔ جیسا کہ آپ فرماتے ہیں۔ **سلم علیٰ من عرفت و من لم تعرف** ا۔ یعنی سب کو سلام کہنا چاہیئے۔ خواہ واقف ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب یہ سنا۔ تو انہوں نے عیسائیوں۔ یہودیوں اور دیگر مذاہب والوں کو بھی سلام کہنا شروع کر دیا۔ اس پر کسی نے کسی صحابی پر اعتراض کیا کہ آپ غیر مسلموں کو کیوں سلام کہتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے۔ **سلم علیٰ من عرفت و من لم تعرف** کہ تو جس سے ملے۔ خواہ وہ واقف ہو یا نہ ہو۔ سلام کہو۔ اس لئے ہم جس سے واقف نہیں ہوتے۔ اور نہیں جانتے کہ اس کا کیا مذہب ہے۔ اسے بھی کہہ دیتے ہیں۔ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ارشاد کے بعد صحابہ میں سلام اس حد تک جاری ہو گیا کہ حدیث میں آتا ہے ایک صحابی عصر کے وقت صرف سلام کرنے کی خاطر بازار جایا کرتے تھے۔ کوئی سودا وغیرہ لینا ان کا مقصد نہ ہوتا تھا۔ صرف سلام کی غرض سے بازار جاتے تھے ۲۔

اس سے معلوم ہوا کہ سلام کہنا کوئی چھوٹی سی نیکی نہیں جسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔ اور اس

کی نگہداشت نہ کی جائے۔ یہ اخوت اسلامی کے قائم کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اور اس سے اخوت اسلامی پیدا ہو سکتی ہے لیکن ہماری جماعت اس میں سست ہے۔ اور ان میں آہستہ سلام کہنے یا سلام کا آہستہ جواب دینے کی مرض ہے۔ وہ آہستہ سلام کا جواب دے کر سمجھتے ہیں کہ ہم نے سلام کا جواب دے دیا۔ حالانکہ سلام کہنے والے نے ان کے جواب کو سنا تک نہیں ہوتا اور نہ سننے کی وجہ سے وہ غرض جو سلام کے کہنے میں اخوت اسلامی کے قائم کرنے کی شریعت نے رکھی تھی اور جس کے قیام کے لئے یہ جاری کیا گیا تھا۔ مفقود ہو جاتی ہے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ یہ عادت ہماری جماعت میں ان کی سابقہ صحبت کی وجہ سے پڑی ہوئی ہے۔

کیونکہ آج کل مسلمانوں میں سلام کہنا یا اس کا جواب دینا عادت کے طور پر رہ گیا ہے اور اس کی اصل غرض مفقود ہو گئی ہے۔ چونکہ بعض اخلاق انسان میں مصاحبت کی وجہ سے آجاتے ہیں اور بعض اخلاق اور عادات انسان میں وراثتاً آتے ہیں اس لئے یہ مرض ہماری جماعت میں سابقہ مصاحبت کا ہی نتیجہ ہے جس سے السلام علیکم کی غرض تو مفقود ہو گئی ہے صرف ایک رسم اور عادت رہ گئی ہے۔ جس کی وجہ سے لوگ صرف سلام کے جواب میں ہونٹ ہلا دیتے ہیں اور بلند آواز سے سلام نہیں کہتے اور نہ ہی اس کی غرض کی طرف کبھی انہوں نے توجہ کی ہے وراثتاً کسی عادت کے پائے جانے کی مثال یہ ہے کہ ایک بچہ ہوء ہوء سے تو ڈرتا ہے لیکن ڈھول بجانے سے نہیں ڈرتا اور ایک علم طبعیات کا ماہر لکھتا ہے کہ بچے عموماً ڈھول سے نہیں ڈرتے۔ مگر ہوء ہوء کی آواز سے ڈر جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب پہلے زمانہ میں لوگ جنگلوں میں رہتے تھے۔ اور شیروں کی آواز سنتے تھے۔ تو اس سے خوف زدہ ہوتے تھے۔ اس کا اثر اب تک چلا آتا ہے۔ اور جب کسی بچہ کے سامنے ہوء ہوء کیا جاتا ہے تو وہ اس خوف کی وجہ سے ڈر جاتا ہے اگرچہ اس کے سامنے شیر تو نہیں ہوتا اور نہ اس نے شیر کی آواز سنی ہوتی ہے پس شیر تو مٹ گیا۔ مگر اس کی آواز کا اثر رہ گیا۔ اسی طرح سلام کے متعلق ہے کہ غرض تو مٹ گئی ہے۔ اور رسم رہ گئی جس کے اظہار کے لئے لوگ صرف ہونٹ ہلا دیتے ہیں۔ یہ ہونٹ ہلانے کی مرض احمدیوں میں غیر احمدیوں کی سابقہ مصاحبت کی وجہ سے آئی ہے یہ نہیں کہ یہ لوگ متکبر ہیں اور بلند آواز سے سلام کہنا نہیں چاہتے بلکہ اصل میں یہ ایک حجاب ہے اور کچھ نہیں۔ ہمیں اس حجاب کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ اور سلام کے حکم کی پابندی کرنی چاہیئے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کو اخوت اسلامی کی ایک ضروری علامت قرار دیا ہے اور اس کو اخوت اسلامی کے لئے ایسا ضروری قرار دیا ہے۔ جیسے آپ نے نماز کی صفوں کا

سیدھا ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ جب سے مسلمانوں نے ان احکام کی پروانہ کی اور انہیں چھوٹا سمجھتے ہوئے ترک کر دیا اسی وقت سے انہیں زوال شروع ہو گیا۔ مسلمانوں نے سلام اور صفوں کے ٹھیک کرنے کو معمولی حکم قرار دے کر ان کی کماحقہ ' نگہداشت نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے اخوت مٹ گئی اور جن حکموں کو انہوں نے چھوٹا سمجھ کر چھوڑ رکھا تھا وہی ان کے زوال کا باعث بن گئے کیونکہ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بڑے بڑے نتائج پیدا کرتی ہیں۔

پس تم سلام کو چھوٹی اور معمولی بات سمجھ کر نہ چھوڑ دو بلکہ اس کی نگہداشت کرو کیونکہ یہ کوئی معمولی سی بات اور چھوٹا سا حکم نہیں بلکہ اخوت اسلامی کے قیام کے لئے ایک ضروری اور لابدی امر ہے شریعت نے اسے ایک شعار قرار دیا ہے۔ پس چھوٹے اور بڑے بوڑھے اور بچے سب اس کی نگہداشت کریں وہ لوگ جو بڑے درجوں پر ہیں چھوٹوں کو سلام کریں۔ یہ نہ ہو کہ وہ یہ خیال کر کے چپ رہیں کہ ہم بڑے ہیں چھوٹوں کو چاہیئے ہمیں سلام کہیں اور چھوٹے یہ خیال کر کے چپ رہیں کہ بڑے ہمیں سلام کریں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ کوئی بھی ان میں سے سلام نہ کہے دونوں چپ چاپ گذر جائیں اور اخوت پیدا کرنے کی وہ غرض مفقود ہو جائے جس کے لئے سلام کو شریعت نے مقرر کیا ہے۔ پس جب کبھی وہ لوگ جو بڑے درجوں پر متعین ہیں چھوٹے درجے کے لوگوں سے ملیں تو پہلے سلام کریں اور اس بات کا خیال نہ کریں کہ ہم بڑے ہیں ہمیں سلام نہیں کرنا چاہیئے چھوٹوں کو چاہیئے کہ ہمیں سلام کریں۔ بلکہ میرے نزدیک انہیں سلام کرنے میں پہل کرنی چاہیئے۔ اسی طرح جب ایک درجہ کے دو مومن ایک دوسرے کو دیکھیں تو دیکھنے کے ساتھ ہی سلام کریں یعنی جس کی نظر پہلے پڑ جائے وہ سلام کہے۔ سلام کرنا اسلامی اخلاق میں سے ایک بہت بڑا خلق ہے اور یہ خلق ہماری جماعت کے ہر فرد میں پایا جانا چاہیئے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا قومی شعار ہے کہ جس کے مضبوط کرنے سے ہم میں اخوت اسلامی قائم رہ سکتی ہے پس میں امید کرتا ہوں کہ ہمارے دوست سلام کہنے میں کوتاہی نہیں کریں گے۔ اسلامی شعار کو اسی طرح ادا کریں گے جس طرح کہ صحابہ کے وقت ادا ہوتا تھا۔

ولایت جانے کی غرض اور اخراجات

دوسری بات جو وہ اپنے خط میں لکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ روپیہ جو آپ کے ولایت جانے پر خرچ ہو گا اگر اسی کو یتیم خانے پر لگا دیا جائے تو بہت اچھا ہو۔ اول تو میں نے بتلایا ہے کہ ابھی جانے کی

نسبت فیصلہ نہیں ہوا۔ جماعت کا مشورہ لیا گیا ہے اور احباب سے کہا گیا ہے کہ وہ استخارہ کر کے بتائیں کہ یہ وقت ولایت جانے کے لئے مناسب ہے یا نہیں۔ پس جماعت کے مشوروں اور استخاروں کے بعد اس امر کا فیصلہ ہو گا کہ جانے کے لئے یہ وقت مناسب ہے یا نہیں۔ لیکن فی الحال میں اس غلط خیال کی تردید کرنا چاہتا ہوں جو اخراجات کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ ممکن ہے۔ یہ خیال کسی اور کے دل میں بھی پیدا ہو اور دوسرے لوگ بھی اس دھوکے میں پڑیں۔

اسلام کے تمام رکن معیّن اور مقرر ہیں اور ان کی حد بندی ہے۔ زکوٰۃ کو لو تو اس کی حد بندی ہے کہ چالیس روپے ہوں۔ اور ان پر سال گذر جائے تو ایک روپیہ دو۔ یہ نہیں کہا کہ سب مال دے دو۔ پھر روزے ہیں۔ ان کے متعلق یہ نہیں کہا گیا کہ ہمیشہ ہی روزے رکھا کرو۔ بلکہ خاص رمضان کے مہینے میں روزے رکھنے کا حکم ہے۔ برخلاف اس کے وہ شخص جو شریعت کے اس حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اور تمام سال روزے رکھتا ہے۔ اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس کے ٹھہرنے کی جگہ دوزخ کا سب سے نچلا درجہ ۳۔ ہے۔ تو دیکھو۔ آپؐ نے اس شخص کے لئے جو ہمیشہ روزے رکھتا ہو۔ کیسی سزا مقرر کی ہے۔ پھر جس طرح زکوٰۃ اور روزوں کی حد بندی ہے۔ اسی طرح حج کے متعلق ہے کہ تمام عمر میں ایک دفعہ کرنا فرض ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ہر سال کیا کرو۔ اور پھر اس کے کرنے کے متعلق شرائط مقرر کر دی ہیں۔ جن میں وہ پائی جائیں۔ وہ حج کریں۔ اور جن میں نہ پائی جائیں۔ وہ نہ کریں۔ اسی طرح نماز کو لو۔ نماز بھی پانچ وقت کی مقرر کی ہے۔ یہ نہیں کیا کہ تمام دن نماز ہی پڑھتے رہا کرو۔ پھر بعض اوقات میں نماز نہ پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ مثلاً سورج کے طلوع ہونے کے وقت یا غروب ہونے کے وقت یا دوپہر کے وقت۔ اس طرح صدقہ و خیرات کی بھی حد بندی ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ نہ تو تو اپنے ہاتھوں کو بالکل کھول دے۔ اور نہ ان کو بالکل بند رکھ بلکہ درمیانہ چال چل ۴۔۔ پس شریعت نے تمام ارکان کی حد بندی کی ہے۔ اور ہر ایک کی کچھ نہ کچھ حد مقرر کر دی ہے۔ تاکہ انسان اس حد سے آگے بڑھ کر نقصان نہ اٹھائے پس شریعت نے ان رکنوں میں مال خرچ کرنے کی حد بندی کر دی ہے۔ جن میں مال خرچ کیا جاتا ہے۔ اور تمام مال کے خرچ کرنے سے منع فرمایا ہے اور ان رکنوں میں وقت خرچ کرنے کی حد بندی کر دی ہے۔ جن میں وقت کی قربانی کی جاتی ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ تمام دن خدا تعالیٰ کی عبادت ہی کرتے رہو۔ اور کچھ نہ کرو بلکہ شریعت نے اپنے نفس کا بھی حق مقرر کیا ہے۔ بیوی کا حق بھی رکھا ہے اور دوسرے حقوق بھی قرار دیئے ہیں۔ اپنے نفس کے حق کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی

ہے۔ **اما بنعمت ربک فحدث** (الضحیٰ ۱۲) یعنی اے انسان جو انعام اور نعمتیں خدا نے تم کو دی ہیں۔ ان کا شکر کر اور ان کو لوگوں میں ظاہر کر اور بتا کر میرے رب نے مجھ کو یہ نعمت دی ہے۔ پس خدا تعالیٰ کی نعمت کو لوگوں میں ظاہر کرنا چاہیئے۔

یہ نہیں کہ جو روپیہ ملے۔ اس کو ایک ہی شاخ میں خرچ کر دینا چاہیئے اور دوسری شاخوں کو نظر انداز کر دینا چاہیئے۔ مثلاً جو روپیہ آتا ہے۔ اگر وہ یتیموں پر ہی خرچ کر دیا جائے۔ اور دیگر شاخوں کا لحاظ نہ رکھا جائے۔ تو سلسلہ میں جلد ہی تباہی آ جائے۔ اگرچہ یتیموں کا خیال رکھنا ضروری ہے اور اسی وجہ سے اب بھی ۴۰ ہزار روپیہ سالانہ کے قریب ان پر خرچ کیا جاتا ہے۔ اور اس کے علاوہ وہ روپیہ بھی ہے جو الگ الگ جماعتوں کے ذریعہ سے خرچ کیا جاتا ہے اگر وہ بھی ملا لیا جائے۔ تو نصف چندہ کے برابر ہو جاتا ہے۔ موجودہ صورت میں ہم یتامیٰ کا جس قدر خیال رکھ سکتے ہیں۔ اتنا رکھا ہوا ہے۔ لیکن اگر ہم یہ خیال کر لیں کہ چندہ کا جس قدر روپیہ آئے۔ وہ یتیموں پر ہی خرچ کر دیں۔ اور دیگر سلسلہ کے کام روک دیں۔ مثلاً لنگر خانہ بھی بند کر دیں۔ تبلیغ پر خرچ نہ کریں۔ نہ ہی تالیف و تصنیف پر خرچ کریں۔ تو نتیجہ یہ ہو کہ سلسلہ چند دن میں تباہ ہو جائے۔ سلسلہ کو قائم رکھنے کے لئے مختلف رنگوں میں کام ہو رہا ہے اور مختلف طریقوں سے اس کو قوت پہنچائی جا رہی ہے۔ اور یہ ضروری ہے کہ سلسلہ کے قیام کے لئے ساری شاخوں کا خیال رکھا جائے اس میں شک نہیں کہ یتامیٰ کا معاملہ نہایت ضروری ہے۔ اس کا خیال رکھنا ایک لابدی امر ہے۔ اور اسی بات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نصف کے قریب چندہ یتامیٰ پر خرچ کرتے ہیں۔ اگرچہ ہمارا ان پر خرچ کرنا عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہم نے کوئی یتیم خانے نہیں بنائے ہوئے اور نہ ان پر بورڈ لگائے ہوئے ہیں۔ جن سے ظاہر ہو کہ اتنے یتیم خانے یہاں ہیں اور اتنے یتیم ان میں رہتے ہیں۔ اور اتنی بیوائیں ان میں سکونت پذیر ہیں لیکن باوجود اس کے کہ ہم نے ظاہری یتیم خانے نہیں بنائے ہوئے۔ پھر بھی میں ۵۶ ہزار کے قریب روپیہ ان پر خرچ کرتا ہوں اور باقی نصف اور صیغوں پر خرچ ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جتنا روپیہ یتامیٰ پر خرچ ہوتا ہے اوروں پر خرچ نہیں ہوتا کیونکہ کل چندہ ایک لاکھ ۴۰ ہزار کے قریب ہوتا ہے جس میں سے ۵۶ ہزار یتیموں اور بیواؤں پر خرچ ہوتا ہے اور باقی نصف تمام صیغوں پر خرچ ہوتا ہے یہ ضروری ہے کہ تمام صیغوں پر یکجائی نظر رکھی جائے اور سب کا خیال رکھ کے سب پر خرچ کیا جائے کیونکہ اگر ہم ایسا نہ کریں۔ اور سب پر روپیہ برابر خرچ نہ کریں۔ تو سلسلہ تباہ ہو جائے اور کام رک جائے۔

ہم کو بعض دفعہ روپیہ اس لئے خرچ کرنا پڑتا ہے۔ کہ دنیا میں اسلام کی شان و شوکت ظاہر ہو۔ اور اس کے نام پر جو دھبہ لگایا جا رہا ہو۔ وہ مٹ جائے۔ اگر ہم ہمیشہ اور صیغوں کا خیال رکھیں۔ اسلام کی شان و شوکت کے لئے کچھ نہ خرچ کریں تو اس سے بھی اسلام کو نقصان پہنچے گا۔ پس اسلام کی شان و شوکت کو ظاہر کرنے کے لئے بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس کے لئے روپیہ خرچ کیا جائے۔ چنانچہ ملکانہ میں جو ہم نے تبلیغ شروع کی ہے۔ اس کی ایک غرض یہ بھی تھی کہ اسلام کے رعب اور شوکت کو مٹانے کے لئے آریوں نے جو شدھی کا سلسلہ جاری کیا تھا اسے روکا جائے۔ اور اسلام کی شوکت کو مشتبہ نہ ہونے دیا جائے۔ اس غرض کے لئے ہماری جماعت کو اپنا مال و جان اور وقت خرچ کرنا پڑا۔ بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ جس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ سلسلہ کا نام ایک شان کے ساتھ شہرت پا گیا۔ اور ایسے لوگوں کو جو پہلے اس کی طرف توجہ نہ کرتے تھے توجہ پیدا ہو گئی۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ ملکانہ تحریک کے بعد سے بہت سے لوگ سلسلہ میں داخل ہونے شروع ہو گئے ہیں۔

غرض کبھی اسلام کی شہرت کے لئے بھی روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اور تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں میرے ولایت جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا اس وقت جانا مناسب ہے یا نہیں اس وقت روپیہ کا سوال نہیں ہے اور اگر میں ولایت جانے کو ملتوی اس لئے کر دوں کہ یہ روپیہ یتیموں پر خرچ ہو جائے۔ تو میں کہتا ہوں اس طرح سلسلہ کی ترقی کا وہ پہلو چھوٹ جائے گا۔ جو شہرت سے تعلق رکھتا ہے اور جو عظیم الشان ترقی کا باعث ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ میرے جانے سے سب لوگ مسلمان ہو جائیں گے۔ لیکن کم از کم یہ تو ضرور ہو گا کہ اسلام کی اصل تعلیم ان کے سامنے پیش ہو سکے گی۔

پھر اگر ہم اس خط کے لکھنے والے کا کہنا مان کر یہ روپیہ یتیموں کی تربیت پر خرچ کرنے کا ارادہ کریں۔ تو کئی لوگ ایسے کھڑے ہو جائیں گے۔ جو یہ مشورہ دیں گے کہ یہ روپیہ تبلیغ پر خرچ ہو۔ یتیموں کا گزارہ تو ہو ہی رہا ہے اور جب ہم ان کا کہنا مان کر تبلیغ پر خرچ کرنے کا ارادہ کریں گے تو کئی لوگ ایسے کھڑے ہو جائیں گے۔ جو تعلیم سے محبت رکھتے ہوں گے اور یہ کہیں گے کہ روپیہ تعلیم میں خرچ ہو ۔ اس طرح خرچ کرنے کے متعلق فیصلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تو اب ہم کو سب صیغوں پر یکجائی نظر رکھنی چاہیئے اور کسی خاص پہلو پر زور نہیں دینا چاہیئے ورنہ سلسلہ پر تباہی آ جائے گی اور اس صورت میں سلسلہ کو مضبوط سمجھنا ایسا ہی ہو گا جیسا کہ کہا جائے فلاں شخص خوبصورت ہے۔ مگر اس کی آنکھ اندھی ہے۔ یا ناک کٹا ہوا ہے پس سلسلہ اسی وقت تباہی سے بچ سکتا ہے۔ جب تک کہ

وہ سارے صیغوں کا خیال رکھے۔ اور ہم نے تو یہاں تک کیا ہے کہ یتیموں کی خبر گیری کے لئے ہم نصف روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ اور باقی نصف چندے کا اور صیغوں میں خرچ ہوتا ہے۔ پس یتیموں کی خبر گیری کا ہم نے سب سے زیادہ اہتمام کیا ہے۔ اگرچہ وہ اہتمام ظاہر نہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں پر ہمارے ہاں اس طرح یتیم خانے نہیں بنے ہوئے۔ جس طرح اور انجمنوں نے بنائے ہوئے ہیں اور ان پر بورڈ لگے ہوتے ہیں۔ ہم نے یہ اس لئے نہیں کیا کہ ہم شہرت نہیں چاہتے۔ ہم فی سبیل اللہ ان کی تربیت کرتے ہیں اور ان کی تربیت کے لئے ۵۶ ہزار روپیہ خرچ کرتے ہیں اگر آج اس رقم کو ان پر خرچ کرنا بند کر دیا جائے۔ تو سب کو پتہ لگ جائے کہ یہاں کتنے یتیم ہیں۔ اور اگر آج بیواؤں کی مدد اور ان کے وظائف بند کر دیئے جائیں۔ تو تین چار سو آدمی قادیان میں بھوکے پھرتے نظر آئیں۔ اور پتہ لگ جائے کہ کتنی بیوائیں اور یتیم بچے قادیان میں رہتے ہیں۔

پس ہم یتیموں اور بیواؤں کا خیال' سب سے زیادہ رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی دوسرے صیغوں کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ اور یہی صورت کامیابی کی ہے ورنہ اگر سب صیغوں پر نظر رکھنی چھوڑ دی جائے تو فوراً سلسلہ میں تباہی آ جائے۔ اور جب کبھی تم اس نکتہ کو چھوڑو گے یقیناً وہ وقت تمہاری تباہی کا پہلا قدم ہو گا اور اسی وقت سے تمہاری تباہی شروع ہو جائے گی۔ پس تم سلسلہ کے قیام کے لئے سب صیغوں کا خیال رکھو۔ اور ان کی ضرورتوں کے مطابق ان پر خرچ کرو۔

(الفضل ۱۳ جون ۱۹۲۴ء)

۱؎ بخاری و مسلم بروایت مشکوٰۃ کتاب الاداب باب السلام

۲؎ مشکوٰۃ کتاب الاداب باب السلام

۳؎ مسند احمد جزو ۴ ص ۲۱۴

۴؎ بنی اسرائیل: ۳